آصف الدولہ کا عہد اور لکھنؤ کی زبان و شاعری

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی

آصف الدولہ کا عہد لکھنؤ کی زبان و شاعری کی تشکیل میں خاص اہمیت رکھتا ہے، ان کا لکھنؤ کو دارالحکومت بنانا دولت کی افراط ان کی الوالعزمی، سخاوت، شہر کی آرائش، تعمیر کا شوق، شاعری سے ذوق، اہل کمال کی قدردانی، تعزیہ داری سے والہانہ عقیدت، غفرانمآبؒ کی تحریک ان کے عہد کے اہم واقعات ہیں، جن کا اثر تہذیب وتمدن اور زبان وشاعری پر بہت گہرا ہوا اور اس کا ذکر لکھنؤ کی زبان وشاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

لکھنؤ صدیوں سے علوم ظاہری و باطنی کا مرکز اور ایک زمانہ سے صوبہ کا صدر مقام تھا۔

شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر بنایا تو ساری دنیا وہاں کھینچ کے آگئی مگر لکھنؤ کے بیشتر علماء کی نگاہ استغنا نے ادھر نہیں دیکھا اور وہاں علمی مرکزیت اور درسگاہوں کی چہل پہل میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ کو پھر دارالحکومت بنایا تو فیض آباد اپنی پوری جوانی ورعنائی کے ساتھ لکھنؤ آگیا اور وہاں کی دنیا بدل گئی۔

میر علی لطفؔ جو آصف الدولہ کے متوسلین میں ہیں بیان کرتے ہیں:

ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی موجود تھا (گلشن ہند)

دفعتاً ایک شہر کے لکھنؤ منتقل ہو جانے سے بہت سے نئے محلے بس گئے۔ شررؔ نے ان کے نام یہ لکھے ہیں:

امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، بیگم گنج، نواب گنج، ٹکیت گنج، وزیر گنج، ترمنی گنج، حسن گنج، بھوانی گنج، بالک گنج، نواز گنج، تحسین گنج، علی گنج، محبوب گنج، عنبر گنج، خیالی گنج، نخاس، خانساماں کا احاطہ، ٹکیت رائے کا بازار، حسین الدین خان کی چھاؤنی، کشمیری محلہ، صورت سنگھ کا احاطہ، نگریا، توپ دروزہ، جھاؤلال کا پل۔

دولت کی افراط اور آصف الدولہ کی سخاوت

آصف الدولہ نے انگریزوں کے مشورہ سے فوج کم کردی، اس کے صلہ میں انہوں نے روہیل کھنڈ پر ان کا قبضہ کرادیا۔ اس سے دولت کی افراط ہوگئی اور انہیں دل کھول کے روپیہ خرچ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ان کے جتنے مشاغل تھے، ان سے رعایا پر زرو جواہر کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برسا کرتی تھیں۔ اس سے ایسی خوشحالی پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ کتنے مفلس و نادار ان کی ایک نگاہ کرم سے دولت مند بن گئے۔ جہلا اور خاص طور پر ہنود جو حکمران کو ''دیو'' کہتے ہیں، کہا کرتے تھے۔

''جسے نہ دے مولا، اسے دے آصف الدولہ''

آصف الدولہ کی جدت پسندی اور الوالعزمی

وہ ایک جدت پسند اور الوالعزم آدمی تھے، جو کام کرتے تھے اس میں نئی راہ نکالتے تھے اور دل کھول کے کرتے تھے۔ سخاوت کی، تو اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ شکار کا شوق کیا تو نشانہ کی ایسی مشق کی کہ شیر، ہاتھی اور ارنا بھینسے ایک گولی میں اپنی جگہ سے نہ ہل سکے۔ شیر اتنے مارے کہ ان کی کھالوں کا شامیانہ بنوایا اور ہاتھی اتنے شکار کئے کہ ان کے دانتوں سے ایک مکان بنوایا جس میں لکڑی کا کہیں نام نہ تھا۔ ایک مکان شیشہ کا بنوایا۔

لکھنؤ کی ترقی

شہر کی ترقی پر توجہ کی تو باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا اور ایرانی طرز کے چار سو باغ بنوائے، جن میں عالیشان عمارتیں

حوض، فوارے، روشیں، کیاریاں اور درختوں کی قطاریں سبھی کچھ تھا۔ انگریز اس کو گارڈن آف انڈیا (garden of india) کہتے تھے۔ میر علی لطف کا بیان کہ آصف الدولہ ہر روز ایک تازہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے تھے، امراء اور اہل شہر کو بھی عمارت کا شوق پیدا ہوا اور لکھنؤ عالیشان عمارتوں کا شہر بن گیا۔ ایک سیاح لکھتا ہے:

''لکھنؤ کی عمارتوں میں طلائی گنبد اور گھڑیاں وغیرہ اس کثرت سے ہیں کہ جب سورج کی روشنی ان پر پڑتی ہے تو سارا شہر جگمگا اٹھتا ہے۔''

عبدالحلیم شرر بیان کرتے ہیں:

''ان دنوں لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں، شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج وعروج کا مقابلہ نہ کرسکتا ہوگا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں پر صرف کرتے تھے، اسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی اور شہر کی آرائش اور خوشحالی میں صرف کرنا شروع کیا اور چند ہی روز میں ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کرلی۔ ان کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدرآباد ہوں یا ٹیپو سلطان، کسی کے دربار کا کرّوفر اور شان وشوکت و حشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔''

اس الوالعزمی کی ایک مثال شرر کی زبانی سنیے:

''وزیر علی خاں کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے، دولہا جو شاہی خلعت پہنے ہوئے تھا۔ اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لئے دو عظیم الشان شامیانے بنوائے گئے تھے جن میں ہر ایک ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھا اور ایسا نفیس وعمدہ وقیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ ان دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہوگئے تھے۔'' (گذشتہ لکھنؤ)

آصف الدولہ اور تعزیہ داری

اسی الوالعزمی سے وہ تعزیہ داری بھی کرتے تھے، ان کا امام باڑہ ہندوستان کی مشہور عمارتوں میں ہے، جس کا رومی دروازہ، باؤلی، بھول بھلیاں اور لداؤ کی چھت، عمارت کی وسعت، شان و شوکت اور فنی اہمیت سیاحانِ عالم کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔''

اس کی آرائش کی طرف توجہ ہوئی تو ایسا سجایا کہ آدمی دیکھتا ہی رہے مرزا ابوطالب کا بیان ہے کہ:

''اس عمارت کے اندر دورویہ دیوار پر قدآدم آئینے لگے ہوئے ہیں، سونے چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا ہے، سونے کا آرائشی سامان کثرت سے لگا ہوا ہے۔ چار پانچ سو بلوری جھاڑ چھتوں میں لٹکے ہوئے ہیں اور دو ہزار فرشی جھاڑ زمین پر رکھے ہیں۔ ان میں بے شمار کافوری شمعیں روشن کی جاتی ہیں۔ جب ان کی روشنی میں طلائی مرصع سامان آرائش کا عکس پڑتا ہے تو نور کا دریا لہریں مارتا ہے۔'' (تفضیح الغافلین)

۱۸۲۴ء میں بادری ہیبر (Heber) سیاحت لکھنؤ کے لئے آئے تھے وہ لکھتے ہیں:

''اس مقدس عمارت میں کثرت سے جھاڑ لٹک رہے ہیں، جنکی روپہلی سنہری ڈالوں، پھل دار ترشی ہوئی قلموں کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہیں ہیں، وہ فرش پر رکھے ہیں۔ ان کا نچلا حصہ بہت گھیر دار اور اوپر کی جانب گاؤدم ہے بیچ بیچ میں سنہرے اور روپہلے تعزیئے آٹھ آٹھ دس دس فٹ

اونچے رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ نوابان اودھ کے زربفتی پٹکے جن پر آیات قرآنی کڑھے ہوئے ہیں، لٹک رہے ہیں، بڑے بڑے نقرئی وطلائی علم، ڈھالیں، تلواریں، بھالے مرصع جن جن پر آیات قرآنی اور اسمائے الٰہی لکھے ہوئے ہیں نصب ہیں، مشہور سپہ سالاروں کے عمامے رکھے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔"

مورخیں لکھتے ہیں کہ سامان آرائش کی اتنی کثرت تھی کہ لوگ اندر نہ جاسکتے تھے، چبوترے سے زیارت کرتے تھے۔

لاکھوں روپیہ کا سامان آرائش اورسونے چاندی کے تعزیے یورپ سے بن کے آئے تھے اور یہ سب کسی مختصر جگہ نہیں بلکہ ساٹھ فٹ چوڑا ۱۰ ۲۳ فٹ لمبا اور تریسٹھ فٹ اونچا صرف پیچ کا ہال ہے جس میں کوئی ستون نہیں، اردگرد کی صحنچیاں، شہ نشین اور آگے کا دالان جو اسی مناسبت سے لمبا چوڑا ہے، اس کے علاوہ ہیں، یہ سب زمین سے لے کے چھت تک سامان آرائش سے بھرا تھا۔

وہ تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتے تھے، اپنے امام باڑہ کے علاوہ اور تعزیوں پر خود جا کے نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو تعزیہ نہ رکھتا ہو اور کوئی کوچہ ایسا نہ تھا جہاں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو۔ دولتمند ہندوؤں نے عالیشان امام باڑے بنوائے جن میں مہاراجہ جھاؤلال، راجہ ٹکیت رائے، راجہ بلاس رائے، راجہ مہرا، راجہ میوہ رام، کے امام باڑے مشہور تھے۔ موخر الذکر کا امام باڑہ امتیاز خاص رکھتا تھا۔ تین لاکھ روپیہ سالانہ اس کا خرچ تھا۔ اس زمانے کے امام باڑے تعزیوں اور سامان آرائش سے بھرے ہوتے تھے، روشنی اور شیرینی کی تقسیم پر سارا روپیہ خرچ ہوتا تھا، مجلسوں پر زیادہ توجہ نہ تھی۔

غفرانمآب علیہ الرحمہ کی تحریک

اس وقت تک ہندوستان میں شیعہ بحیثیت قوم کوئی وجود نہ رکھتے تھے، اہل سنت کے ساتھ ضم ہو کے رہتے تھے۔ مرنا جینا، شادی بیاہ، نماز روزہ، سب انہیں کے ساتھ تھا۔ اس حالت میں باہر سے آئے ہوئے شیعہ تو شیعہ رہے مگر ان کی اولاد اپنے مذہب سے بے خبر ہوتی گئی اور خاندان کے خاندان سنی ہو گئے۔ جو شیعہ رہے وہ برائے نام تھے۔ صرف تحقیقی صلاحیت رکھنے والے اہل علم تک شیعیت محدود تھی، جیسے تفضیل حسین خاں علامہ اور میر شمس الدین فقیر، مصنف حدائق البلاغہ اپنی تحقیق سے شیعہ ہو گئے تھے۔

سادات جائس ونصیرآباد کے علمی خاندان کے ایک فرد سید دلدار علی جو مرنے کے بعد غفرانمآبؒ کے لقب سے مشہور ہوئے ایک مفکر، حساس اور مضبوط ارادے کے آدمی تھے انہوں نے شیعوں کی قومی تشکیل اور مذہبی تبلیغ کا تہیہ کر کے علوم عقلیہ میں کمال حاصل کیا اور لکھنؤ کے سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں وزیر اعظم سے مل کے اپنے خیالات سے ان کو متاثر کیا اور اپنا مؤید بنا کے پانچ ہزار روپیہ ان سے لے کے عراق گئے۔ وہاں پانچ برس کامل قیام کر کے علوم دینیہ میں مہارت حاصل کی اور لکھنؤ واپس آ کے اپنا رابطہ عوام سے قائم کیا۔ حکومت اور اس کے معاملات سے علیٰحدہ رہے۔ ان کی اس بے نیازی سے آصف الدولہ بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اگرچہ ان کی نماز وموعظہ میں کبھی کبھی آتے تھے مگر نہ ان کو کوئی عہدہ دیا، نہ منصب، نہ جاگیر، نہ خطاب، نہ انعام واکرام سے کبھی سرفراز کیا، نہ انہوں نے خواہش کی۔ اس دور عشرت میں وہ عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے اور خوش تھے۔ انہیں اپنے مقصد کے علاوہ کسی اور طرف توجہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی درسگاہ قائم کی جس میں معقول ومنقول، فقہ واصول کے ساتھ کلام ومناظرہ اور ادب کی تعلیم بھی جاری کی، ان کا بڑا کمال یہ تھا کہ تمام علوم کے وہ تنہا معلم تھے۔ ان کے شاگردوں میں جس علم سے جو مناسبت رکھتا تھا وہ اس میں کامل بن کے نکلا۔ کوئی معقولات کا بحر ناپیدا کنار تھا، کوئی حدیث وتفسیر میں بے مثل تھا، کوئی فقہ واصول میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، کوئی کلام ومناظرہ کا مرد میدان تھا اور کوئی بزم ادب وشعر کا صدر نشین۔ خود

ان کی تصنیفیں بھی اسی طرح مختلف النوع ہیں اور ہر ایک بلند پایہ۔ معقولات میں **حاشیۂ صدرا**، علم کلام میں **عماد الاسلام** فقہ واصول میں **اساس الاصول** مناظرہ میں **صوارم اللٰھیات وذو لفقار** وغیرہ، حدیث میں **اثارۃ الاحزان**۔

۱۲۰۰ھ تیرہ رجب کو شیعوں کی نماز جماعت اور ۲۷ رجب کو نماز جمعہ قائم کی اور اس کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب لکھی۔ اخباریت کی رد میں **اساس الاصول** اور صوفیت کی رد میں **شہاب ثاقب** لکھی جس میں صوفیا کو بدعقیدہ، وحدت وجود کو کفر، مراقبہ، سلوک، جذب، کشف، حجاب وغیرہ کو بے معنی اور اسلام کے خلاف قرار دیا، پیری مریدی عرس قوالی چادر وغیرہ کے خلاف تقریر وتحریر کے ذریعہ مہم کا آغاز کیا اور باور کرایا کہ سوائے ائمہ اہلبیتؑ کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں، جو ان کی تعلیم وسیرت سے ہٹ کر کچھ کہے وہ گمراہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیری مریدی، عرس قوالی، شیخ سدّو کا بکرا وغیرہ شیعوں نے قطعاً چھوڑ دیا۔ بھنگ نوشی کا عام رواج تھا کہ اس کے خلاف بھی انہوں نے جدوجہد کی۔ علامہ کنتوری لکھتے ہیں کہ انہوں نے بھنگ نوشی کے چبوتروں پر سجّادے بچھوا دیئے اور نذر ونیاز میں شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کی شیر برنی، احمد کبیر کی گائے......وغیرہ کے بجائے عمل کو سفند اور جناب عباسؑ کی حاضری اور علم وتعزیئے بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

محرم کے رواسم میں انہوں نے انقلاب پیدا کر کے شیعوں اور سنیوں کی تعزیہ داری میں فرق پیدا کیا۔ مجلسوں کے انعقاد پر زور دیا۔ خود بھی امام باڑہ بنوایا اور اس کو سامان آرائش سے بھرنے کے بجائے مجلسوں کا اہتمام کیا اور حدیث خوانی پر زیادہ توجہ کی۔ اس وقت شاعری کا زور تھا۔ نثر کو اتنی مقبولیت نہ ہوئی لیکن مجلسیں گھر گھر ہونے لگیں جن میں واقعہ کربلا زیادہ تر نظم میں پڑھا جاتا تھا اور ہندوستان کا ہزار سالہ ذوق شاعری لکھنؤ میں معراج کمال پر تھا۔ ان دونوں کا اتفاقی طور پر یکجا ہو جانا ایسا نہ تھا کہ مرثیہ اپنے قدیم رنگ پر باقی رہتا۔ اس نے ایک نئے فن کی حیثیت اختیار کی۔ سوداؔ، میرؔ ایسے استادان فن مرثیہ کہنے لگے۔ گداؔ، مسکینؔ، حزیںؔ، غمگینؔ، محمد تقی، نظر علی، نعیمؔ، عاجزؔ، محبؔ، محزوںؔ، احدؔ صوفی ایسے بہت سے مرثیہ گو پیدا ہو گئے۔ بہتوں نے اسے خاص اپنا فن بنالیا، میاں سکندرؔ نے اس میں ایک نئی روح پھونکی اور اب بڑا شاعر مرثیہ گو نہیں رہا۔

حکمراں کا شیعہ ہونا، اہلبیتؑ رسولؐ کے فضائل ومصائب کے بیان سے دلچسپی لینا، غفرانمآبؒ کی سرگرمیاں شیعی معتقدات پھیلانے کا سبب ہوئیں اور بہت سے ہندو مسلمان شیعہ ہو گئے۔

غفران مآبؒ نے باہر کے شیعہ طلبا پر زیادہ توجہ کی اور انہیں عالم بنا کے مستقل قیام کے لئے اطراف ہندوستان میں بھیجا، جہاں انہوں نے شیعوں کی جمعہ وجماعت قائم کی اور شیعوں میں من حیث القوم ایک علٰیحدہ جماعت ظاہر کرنے کی جرأت پیدا کی۔ ان کے مذہبی امور کی انجام دہی اپنے ذمہ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ نماز، نکاح، دفن وکفن ان کے طریقے پر ہونے لگا۔ مذہبی رواسم، لٹریچر، سیاسی نظریات اہل سنت سے بالکل مختلف ہو گئے اور وہ ایک قوم کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں نمایاں ہو گئے اور لکھنؤ ان کا مرکز بن گیا۔

لکھنؤ کا عروج اور دھلی کا زوال:

ادھر آصف الدولہ کی داد ودہش نے لکھنؤ کو عیش وعشرت کا گھر بنایا۔ ادھر دہلی میں سلطنت کی کمزوری سے ملک کی جنگجو قوموں نے یورش کی، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ نہ دن کو امن نہ رات کو چین۔ نوکری مفقود، روزگار نایاب، ہر وقت خوف وہراس۔ انشاؔ جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں بیان کرتے ہیں:

''شاہجہاں آبادیاں در شہر خود بیشتر محتاج
بنان شبینہ وکمتر نان می خورند'' (دریائے لطافت)

مثل مشہور تھی:

''شاہ عالم ثانی، نہ چولہے پہ توا، نہ گھڑے میں پانی''

اس ابتری اور ہلچل سے دہلی میں بھگدڑ مچ گئی اور قافلے کے قافلے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئے اس طرح دہلی کی برسوں کی کمائی

ایک دم سے لکھنؤ کے ہاتھ آ گئی، رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ:

''اس عالم بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاؔء وغیرہ انہوں نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا، جو اس وقت ان کا قدر شناس اور ان کے لئے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی قدردانیوں میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق ومحبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں، وظائف، انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ نازک مزاجیاں اور بدماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انہیں اوصاف کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو مضبوط کرنے کے لئے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر شعراء کو دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق ومصاحب بنالیا۔''

(تاریخ ادب اردو، ص ۲۸۸)

مولوی عبدالحلیم شررؔ لکھتے ہیں:-

''اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے نامور اور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایسا جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔''

(گذشتہ لکھنؤ، ص ۷۷)

یہاں تک نوبت پہنچی کہ شاہی خاندان کے افراد بھی لکھنؤ آ کر آباد ہونے لگے مؤلف تذکرۂ گل رعنا لکھتے ہیں:

''پہلے مرزا جواں بخت شاہ عالم کے ولی عہد لکھنؤ آئے، یہ کچھ دنوں رہ کے بنارس چلے گئے، پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے۔ وہ یہیں رہ پڑے۔''

مرزا سلیمان شکوہ کو حکومت کی طرف سے اتنا ملتا تھا کہ وہ شاہانہ تزک واحتشام سے رہتے تھے اور بڑے بڑے شعراء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔

آصف الدولہ خود باکمال شاعر، تمام اصناف سخن پر قادر اور صاحب دیوان تھے۔ ان کا کلام اس زمانہ میں میرؔ وسوداؔ کے کلام کی طرح مقبول ومشہور تھا۔ سعادت یار خاں رنگینؔ نے دو واقعے 'مجالس رنگینؔ' میں لکھے ہیں جن سے ان کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) کانوڑ [۱] سے نواب نجف خاں نے نواب مرزا جعفر کو دہلی بھیجا اور مجھے دوسو سواروں کے ساتھ ان کے ہمراہ کیا۔ جب ہم ریواڑی پہنچے تو وہاں کے راجہ مترسین نے بڑی پر تکلف دعوت کی۔ کھانے کے بعد محفل رقص وسرود گرم ہوئی۔ نواب نے مغنیہ سے غزل گانے کی فرمائش کی۔ اس نے وزیر الملک نواب آصف الدولہ بہادر کی یہ غزل گائی ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں
وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں

(۲) ہم نواب اسمٰعیل خاں کی فوج کے ساتھ نارنول پہنچے۔ وہاں ایک صاحب ملے، کہنے لگے آپ کا ذکر میں نے اجمیر میں سنا تھا۔ اتفاق سے ملاقات بھی ہوگئی۔ مجھے نواب آصف الدولہ بہادر کے اس شعر کے دوسرے مصرع کی بہت دن سے تلاش ہے ؎

نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی

ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام دور دور

۱۔ ریاست پٹیالہ میں ایک قصبہ مہیندر گڑھ ہے یہ پہلے کانوڑ تھا۔

مشہور تھا۔ لوگ اشتیاق سے سنتے اور محفوظ رکھتے تھے۔ ارباب نشاط ان کی غزلوں سے محفلیں گرم کرتے تھے۔ اس مقبولیت کی وجہ ان کے کلام کی روانی، برجستگی اور سادگی ہے، ایک رباعی ان کی مشہور ہے جو سادگی کے ساتھ پرکاری اور تصنع کے ساتھ برجستگی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایسی رباعی وہی کہہ سکتا ہے جو شاعری پر استادانہ قدرت رکھتا ہو ؎

اے یار جو کسی کو کلپاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دار مکافات میں سن اے غافل
بیداد کرے گا آج تو کل پاوے گا

غزل کی سلاست، روانی اور برجستگی ملاحظہ ہو ؎

ہم نے قصہ بہت کہا دل کا
نہ سنا تم نے ماجرا دل کا

آصف الدّولہ کی بیوی دلہن بیگم نواب شمس النساء شرمؔ بھی باکمال شاعرہ اور صاحب دیوان تھیں۔ اکثر آصف الدّولہ کی غزلوں پر غزلیں کہا کرتی تھیں۔ نواب کی وہ مشہور غزل ؎

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں
وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں

اس پر شرمؔ نے بھی غزل کہی تھی جو آصف الدولہ کی غزل سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں کی غزلیں ملاحظہ کیجئے ؎

آصف	شرم
جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں	خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
وہاں سر ہم اپنا قلم دیکھتے ہیں	اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں	نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں	نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کئے تو نے ہم سے	نگاہ کرم جس جگہ پر کرے تو
بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں	ہم اس جا پہ باغ ارم دیکھتے ہیں
جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا	کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب
تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں	مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں [1]
بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ	کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی
تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں	اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں

شرمؔ کا دیوان مفقود ہے۔ یہ دونوں غزلیں دیوان جہان مصنفہ منشی بینی نرائن کے قلمی نسخے سے ماخوذ ہیں جو لندن کے عجائب خانہ میں رکھا ہوا ہے۔

اودھ کے تمام فرمانروا چاہے کچھ اور نہ رہے ہوں مگر شاعر، عاشق، سپاہی، قدردانِ علم وفن اور مذہب کے دلدادہ ضرور تھے۔

آصف الدولہ بھی بڑے بہادر تھے۔ روہیل کھنڈ کی جنگ میں شجاع الدولہ کے ساتھ تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے بڑی بے جگری سے حملے کرکے بڑے بڑے مورچے توڑ دیئے۔

محمد حسین آزادؔ نے 'آب حیات' میں سوداؔ اور مرزا فاخر مکینؔ کے جھگڑے میں لکھا ہے کہ جب سعادت علی خاں نے آصف الدّولہ سے کہا کہ والد مرحوم نے مرزا سوداؔ کو برادر من مشفق مہربان لکھ کے بڑی آرزو سے بلوایا تو انہوں نے کہا کہ وہ میرے چچا ہیں اور فوراً ان کی حمایت کو تیار ہو گئے۔

اس عزت افزائی اور قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جہاں بھی جس طرح کا کوئی صاحب فن تھا اس نے لکھنؤ کا رخ کیا اور بقول لطفؔ ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی موجود تھا۔ شعراء کا اتنا مجمع تھا، جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ یہاں ان شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی اور دوسرے مقامات سے لکھنؤ آئے۔

میر تقی میرؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ، صلاح الدین پاکبازؔ، خواجہ حسین علی روشنؔ، شاہ مجنون مجنونؔ، محمد علی راحمؔ، میر حیدر علی حیرانؔ، میر ولی اللہ محبؔ، میر محمد حسین منشیؔ، کاظم علی جوانؔ، میر قدرت اللہ رخصتؔ، مرزا جعفر علی حسرتؔ، میر محمد یعقوب عیاشؔ، مرزا ثمر علی ثمرؔ، رائے سرپ سنگھ دیوانہؔ، شیخ عبدالرحیم رعناؔ، میر قمر الدین منتؔ،

۱؎ یہ شعر ان کی آپ بیتی ہے، نواب نے ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ساری زندگی انہوں نے علیحدہ مکان میں حزن و غم میں گذاری، یہ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم دہلی کی پوتی تھیں جو احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے میں مارے گئے۔

میاں عبدالرحیم زیباؔ، مرزا محمد علی شہرتؔ، محمد حیات بیتابؔ، مرزا اسمٰعیل طپشؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ، مرزا فاخر مکینؔ، محمد علی وہمؔ، خواجہ حسن حسنؔ، حسن علی خاں یاسؔ، میر غلام حسین برشتہؔ، مرزا اشرف الدین وفاؔ، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، مرزا محمد حسن قتیلؔ، انشاءاللہ خاں انشاءؔ، میر امانی اسدؔ، میر شاہ علی خان دہلی سے آئے۔

قیام الدین قائمؔ چاند پور سے، اسلام اللہ خاں تسلیمؔ کشمیر سے، میر امام علی صاحبقران مزاحیہ گو، بلگرام سے محمد خاں آگاہؔ، مرزا صفی الدین صفائیؔ، مرزا اکبر علی مونسؔ، مرزا امامی واصلیؔ ایران سے لکھنؤ آئے۔

ان شعراء میں اگر ان کو بھی شامل کر لیجئے جو شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے اور پھر آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ تو ایک جم غفیر ہو جاتا ہے۔

مصنف شعرا لہند کا خیال ہے کہ لکھنؤ کو اس زمانہ میں مرکزیت حاصل ہوگئی تھی وہ لکھتے ہیں:

''انہوں (آصف الدولہ) نے نہایت فراخ حوصلگی سے شعراء کی قدردانی کی اور ان کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، اس لئے اب بجائے دہلی کے لکھنؤ شاعری کا مرکز بن گیا۔ عام طور پر منتخب اور برگزیدہ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس طرح جو مرکزیت اس کو حاصل تھی وہ لکھنؤ کو بھی حاصل ہوگئی۔'' (ص ۳ ج ۲)

لیکن یہ مرکزیت دہلی والوں کے آنے سے پیدا ہوئی تھی اور دہلی سے علیٰحدہ کوئی چیز نہ تھی۔

لکھنؤ کے تمدن کا آغاز:

اس میں شک نہیں شجاع الدولہ کے زمانہ سے دہلی کے ارباب کمال یہاں آکے اطمینان سے بیٹھے تو اپنے اپنے فن میں خوبیاں اور دل فریبیاں پیدا کرنے لگے جس سے لکھنؤ کا تمدن دہلی سے ممتاز ہونے لگا، اس کا اثر زبان و شاعری پر بھی ناگزیر تھا۔

شجاع الدولہ کی جنگی تیاریوں اور سپاہیوں کی کثرت سے عام طور پر لوگوں میں اکڑ تکڑا اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے، گوٹا لچکا جو دہلی کے مردوں کی پوشاک کا جز تھا یہاں معیوب سمجھا جانے لگا، قرابین (تپنچہ) ڈھال، تلوار، کٹار وضع میں داخل ہوگئی۔

اگرچہ آصف الدولہ نے فوج کم کر دی مگر سپاہیوں کا ٹھکانا سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہ تھا۔ ہندوستان کی جنگ جوئی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کچھ انگریزی فوج میں ملازم ہو گئے، باقی رئیسوں کی سرکار میں کھپ گئے۔ اس طرح فوج ٹوٹنے پر بھی لکھنؤ میں سپاہیوں کی کمی نہ رہی اور سپہ گری کا فن یہاں ترقی کرتا رہا۔

آصف الدولہ نے فوج کم کرنے کے بعد اپنے جنگ جویانہ جذبات کی تسکین کے لئے شیر اور ہاتھی کی لڑائی کا تماشا دیکھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس میں اور جدت پیدا کی گئی اور مرغ و بٹیر بھی لڑائے جانے لگے۔ یہ دونوں لڑائیاں ایسی تھیں جن سے عوام بھی دل بہلا سکتے تھے۔ چنانچہ مرغ بازی اور بٹیر بازی لکھنؤ میں عام ہوگئی۔ شطرنج اور چوسر کے بھی لوگ شائق تھے۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے دہلی اور دور دراز مقامات سے ارباب نشاط آکے آباد ہو گئے تھے اور لکھنؤ حسین و مہ جبین عورتوں سے پرستان بن گیا تھا۔

موسیقی کو اتنا عروج ہوا کہ لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا۔ علم و دوانش کے پرستاروں نے اس کے آگے سرِ نیاز جھکا دیا۔ تفضّل حسین خاں علامہ جن کے متعلق محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی رائے ہے کہ ابوالفضل کے بعد اگر علامہ کا خطاب کسی کو زیب دیتا ہے تو وہ تفضّل حسین خان ہیں، یہ موسیقی کے زبردست ماہر تھے۔

'اصول النغمات الآصفیہ' موسیقی میں معرکہ آرا کتاب لکھی گئی۔ رفتہ رفتہ اس فن کو اتنی ترقی ہوئی کہ لکھنؤ اور بنارس موسیقی کے دو اسکول آج بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

طب یونانی کے بڑے بڑے کامل جمع ہو گئے تھے، جن کی بدولت لکھنؤ یونان بن گیا تھا۔

علماء میں مولوی مخدوم، شیخ اعظم ثانی، مولوی اعظم سندیلوی، مولوی عبدالحق مخدوم زادہ، مولوی حیدر علی اور مولوی اکبر علی پسران مولوی حمد اللہ، مولوی احمد علی داماد مولوی حمد اللہ۔

علمائے فرنگی محل میں، ملا عبدالحق، ملا حسن، ملا حسین، ملا اولوالرحم ایسے علماء تھے جن کا مثل ہندوستان میں نہ تھا۔

علمائے فرنگی محل کو قضا و افتیٰ کی مسند پر سابق کی طرح بحال رکھا۔ ان کے علاوہ ملا احمد علی کو بھی قاضی مقرر کیا۔

حکومت کی سر پرستی اور علماء کی کثرت نے لکھنؤ کو علوم عربیہ کا مرکز بنا دیا۔ معقول و منقول فقہ و اصول اور کلام و مناظرہ میں بے مثل کتابیں لکھی گئیں اور دور دراز مقامات سے طلبائے علوم اس سرچشمہ علم سے سیراب ہونے کے لئے پہنچنے لگے۔

دولت کی فراوانی، اطمینان اور بے فکری نے روساء، شعراء، علماء، سپاہی، داستان گو، صناع دستکار اور مے فروشان جمال کو یکجا کر دیا۔ اس اجتماع رنگارنگ سے ایک خاص معاشرہ پیدا ہو گیا۔ ہر رئیس کی سرکار سے طبیب، شاعر، شہ سوار، سپاہی اور ارباب نشاط کا وابستہ ہونا ضروری تھا اور رئیس صرف تماشائی نہ تھا بلکہ خود بھی شاعر، شہ سوار اور عاشق مزاج تھا۔ امرد پرستی عیب تھی۔ مہذب اور شائستہ گانے والیوں سے دلبستگی، حسن خلق، خوش پوشاکی، خوش خوراکی، وضع میں داخل تھی۔ نفاست پسندی اور جدت طرازی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما تھی۔ بانکپن کے ساتھ تواضع، فروتنی اور حسن خلق کا دلکش امتزاج تھا۔ شریف پروری اور ہمدردی کا جذبہ عام تھا، اہلبیتؑ سے عقیدت اور مودت، ان کے فضائل و مصائب کا بیان، تعزیہ داری اور مجلس بہترین کارِ خیر تھا اور ان کے دشمنوں سے بیزاری جز و ایمان۔

اس کا اثر زبان و شاعری پر یہ ہوا کہ میرؔ و سوداؔ کا انداز بدل گیا۔ ان کی آہ و زاری اور دنیا سے بیزاری کم ہو گئی۔ انہیں آنکھوں میں شراب کی مستی اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑی نظر آنے لگے۔ غزلوں میں بھی اہلبیتؑ کی منقبت میں اشعار کہے جانے لگے اور تصوف کے مضامین کم ہو گئے۔

بھونڈی لفظیں اور بھدی ترکیبیں محسوس ہونے لگیں۔

سجن، سریجن موہن، پی، پیا، پیتم، پریتم (معشوق) درپن (آئینہ) اچھے (سے) سین۔ سیتی (سے) کدھین (کبھی) وغیرہ متروک ہو گیا۔ اور ان اصلاحوں کو دہلی والوں نے بھی بے تامل قبول کیا، کیونکہ اصلاح کرنے والے دہلوی تھے۔ اس طرح دہلی میں لکھنؤ کی اصلاحوں کو قبول کرنے کی بنیاد پڑی۔

(ماخوذ از نگار پاکستان، اگست ۱۹۶۷ء)

بقیہ۔۔۔۔کیا کوئی چیز جاودانی اور ثابت قدم نہیں

رہی ہے اور سورج کا طواف بھی کر رہی ہے تو کوئی شخص بلا غور و خوض کیے اس دعویٰ کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔ یونہی اگر ہم تک یہ بات پہونچے کہ اس عالم کی ہر چیز نیست سے ہست ہوئی ہے۔ ہر شی کی پہلی حالت نیستی ہے، معدوم ہونے کے بعد وہ وجود میں آئی ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے کہ ہم فوراً اس کی تائید کر دیں۔ اس دعوے پر استدلال ہونا چاہئے۔ اگر قابل اطمینان دلیل موجود ہے تو ہمارا فیصلہ اس دعوے کے حق میں ہوگا ورنہ نہیں۔

اس سے قبل سوفسطائیوں کی رد میں بتایا جا چکا ہے کہ بدیہی اور نظری کسے کہتے ہیں۔ پھر کیف علوم کی ان دو قسموں کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان میں سے جو بدیہیات میں داخل ہیں ہرگز امتداد زمانہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ رہ گئے ایسے نظریات جن کے بارے میں مضبوط قابل اعتماد ادلہ موجود ہیں وہ بھی ٹس سے مس نہیں ہو سکتے، وہ بھی ابدی اور لازوال حقیقتیں ہیں جن کے بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا مادہ پرستوں کے اصول تغیر (The Law of change) کا دائرہ ہمہ گیر نہیں رہا۔

